ڈاکٹر اعجاز راہی

ہندکو ادب ۔ ایک مختصر جائزہ

زبان و ادب کا جائزہ کیوں ضروری ہے؟

یہ سوال اکثر اہل دانش کے سامنے رہا ہے کہ زبان کی تکمیلیت اور ادب کے ثروت پا جانے کے بعد بھی تحقیق و مطالعے کی ضرورت کیوں باقی رہ جاتی ہے..... اصلاً ہر عصر زبان و ادب کے مطالعے اور تحقیق کو اپنے سیاق و سباق اور نئے بنتے ہوئے تناظر میں جاری رکھتا ہے۔ گزشتہ عہد جہاں چھوڑتا ہے۔ نیا دور وہاں سے بات شروع کرتا ہے۔ اگر ہم اردو زبان کے بارے میں غور کریں، تو صرف اردو زبان کی تخلیق کے حوالے سے گزشتہ صدی کے مختلف عشروں میں ہونے والی تحقیق بے شمار نظریات کو سامنے لاتی رہی ہے اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ علامہ اقبال پر ہر نئی کتاب علامہ صاحب کے ایک نئے پہلو کو اجاگر کرتی ہے۔ چنانچہ زبان و ادب کا مسلسل مطالعہ گمشدہ کڑیوں کے ساتھ نئے نئے گوشوں کی بازیافت کا فریضہ بھی ادا کرتا ہے۔ دیگر زبانوں کے ساتھ ہندکو زبان و ادبیات کا مطالعہ کچھ یوں بھی ضروری ہے کہ حکمائے لسانیات نے ہندکو کی قدامت پر زور دیا ہے۔ مگر ہندکو ادبیات کی تاریخ خصوصاً نثری ادب کی تحریری موجودگی کا ۱۹ویں صدنصف آخر سے قبل کا پتہ نہیں چلتا۔ تحقیق و مطالعے سے اب یہ دیکھنا ہے کہ قدامت کے دعوے نادرست ہیں یا پورا درمیانی عرصہ جو دو ہزار سال پر محیط ہے۔ پورا ادب محفوظ نہیں رہا اور اگر یہ درست ہے تو کیا اس کے آثار بھی معدوم ہو چکے ہیں؟ بہر حال ہندکو کے ماہرین لسانیات کو ان سوالوں پر بھی غور کرنا اور وجوہ کی تلاش بھی اسی تحقیق کا حصہ ہونا چاہیئے۔

یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ زبان کا مطالعہ ہمیں صرف یہ نہیں بتاتا کہ مروج

Scanned by CamScanner

زبان کس حد تک خیال، مدعا، فکر یا جذبے کے اظہار میں پوری اترتی ہے۔ مطالعے کا بنیادی فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ بتائے کہ زبان کن مرحلوں سے ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی ہے۔ اس کے تقدس، ارتقاء اور لسانی تشکیلات نے کتنا سفر طے کیا ہے۔ پھر زبان کا مطالعہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ زبان جہاں بولی جا رہی ہے۔ وہاں موجود اقوام نے تہذیب و شائستگی کے کتنے مرحلے طے کیے ہیں۔ زبان کے ساتھ عام زندگی میں حسن و خیر کی تلاش، حک و اصلاح کی کوششیں، شکست و ریخت کے اثرات، تعمیر و تشکیل کی جستجو، اخذ و اکتساب کی خواہش اور رد و قبول کا مسلسل عمل زمینی حقائق سے وابستہ عصری دانش کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے۔

ہندکو کی طرف آتے ہوئے یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ دوسری زبانوں نے یہ سفر کیسے طے کیا ہے۔ مثلاً انگریزی ایک مختصر زبان تھی۔ اس نے اکتسابی عمل کو قبول کیا۔ آج ہمارے عہد کی قبول عام زبان ہے بلکہ سٹیٹس سمبل بن چکی ہے۔ عربی میں اخذ کرکے جذب کرنے کی صلاحیت بدرجہا تھی۔ اس نے جدید علوم کو معرب کر لیا۔ چینی Convergen کی اہلیت رکھتی ہے۔ اس نے دنیا بھر کے علوم کو چینی کر لیا۔ اردو جدید علوم کی اصلاحات کو من و عن قبول کر رہی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہندکو کہاں کھڑی ہے اور اس میں جدید عہد سے ارتباط کے کتنے امکانات موجود ہیں۔

تاریخ میں بے شمار تہذیبوں کا ذکر ملتا ہے۔ مگر ہم سومیریوں کو محض اس لیے یاد رکھ سکے ہیں کہ انہوں نے زبان کی رفعت کا راستہ یعنی فن تحریر پا لیا تھا۔ چنانچہ جب تک بولے جانے والے لفظ کو لکھے جانے والے لفظ کا قالب نصیب نہیں ہوتا۔ اس وقت تک زبان ہوا میں معلق رہتی ہے۔ آج اقوام عالم کی ترقی ان کی زبان کے منہاج رفعت کا اعجاز ہے۔ آج بول چال یا ادب کی زبان ہونا کافی نہیں بلکہ موجودہ عہد میں زندہ رہنے کے لیے علم کی زبان ہونا بھی ضروری ہے۔ تو آیئے ہندکو زبان کی تخلیق سے موجودہ عہد تک اور پھر مستقبل کے امکانات پر ایک مختصر نظر ڈالتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

ہندکو کو آریہ اقوام کی آمد سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ آریہ اقوام کے مختلف قبائل مختلف ادوار میں برصغیر میں اترتے اور برصغیر کے مختلف علاقوں میں پھیلتے رہے..... یہ سلسلہ صدیوں تک جاری رہا ہے۔

ادبیات سرحد کے مصنف سید فارغ بخاری کہتے ہیں کہ پراکرت آریہ اقوام کی مشترکہ زبان تھی کیونکہ پراکرت آریوں کی مختلف اقوام کی زبانوں کے اختلاط سے وجود میں آئی تھی۔ ۱۵ سو سال قبل از مسیح پراکرت سماجی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرتی نظر آتی ہے جبکہ پکت قبیلے کی زبان پکتی تھی جو آگے چل کر پختو (پشتو) یعنی پختونوں کی زبان بنی۔ پختونوں نے اسے بڑی ترقی دی اور اتنا آگے بڑھایا کہ وہ تحریر کا درجہ بھی حاصل کر گئی۔ یہیں ہندکو نے جنم لیا اور ہندکو زبان ہی اردو کی ابتدائی شکل ہے۔ یہ زبان دکنی زبان سے اتنی مماثلت رکھتی ہے کہ دونوں کے مصادر اور بیشتر الفاظ ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بہت سے آریہ قبائل باختر سے اتر کر دریائے سندھ تک کے علاقے میں پھیل گئے جبکہ بھارت قبیلہ آگے بڑھتا ہوا کول اور دراوڑ کو دھکیل کر ان علاقوں میں چھا گیا۔ سید فارغ بخاری نے اس ضمن میں طویل بحث کی اور آخر اس بات پر صاد کر گئے کہ ہندکو ہی اردو کی ابتدائی شکل ہے۔

سید فارغ بخاری کی تائید میں ہندکو زبان کے ماہر اور محقق مختار علی نیر نے کئی کتابیں تحریر کیں اور فارغ بخاری کی نسبت زیادہ موثر دلائل و براہیں اور شہادتوں سے کام لے کر اسے آگے بڑھایا۔

پروفیسر خاطر غزنوی نے ہندکو کی قدامت کو ثابت کرنے کے لیے خروشتی کا ایک کتبہ ۱۹۴۱ء میں ٹیکسلا سے برآمد ہوا تھا، پیش کیا اور اس کے حوالے سے ہندکو زبان کے ماضی کے رشتوں کا انکشاف بھی کیا۔ پروفیسر صاحب نے مزید دلائل اور مبسوط بحث کرتے ہوئے ایک مکمل تحقیقی کتاب ''اردو کی ماخذ ہندکو'' تحریر کی.....

اسی دوران ڈاکٹر الٰہی بخش اختر اعوان نے جنھوں نے لندن یونیورسٹی سے ہندکو

Scanned by CamScanner

"Phinology of Verbal Phrase of کے علم الاصوات پر تحقیق کر کے
"Hindko کے نام سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ۱۹۷۴ء میں حاصل کی تھی۔ زبان کے
فطری عناصر صوت اور صوتیے کو حوالہ بنا کر ہندکو کی قدامت کی بات پر زور دیا تاہم انھوں
نے اس قدر اختلاف بھی کیا کہ ہندکو اقوام آرین ہیں۔ ان کی رائے میں ہندکو قبائل یہیں
کے قدیم باشندوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی آریہ اقوام سے کوئی نسبت نہیں۔ اسی طرز
پر ممتاز شاعر صابر حسین امداد اور نثر و شعر کے ممتاز نام ش شوکت نے بھی عالمانہ تحقیق کی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ قدیم باشندے کون تھے، ان کی زبان اور رسم
الخط کیا تھا۔ کیا ٹیکسلا سے ملنے والے کتبے کے بعد جو کچھ لکھا گیا وہ خروشتی خط میں تھا،
اور پھر اس وقت سے لے کر گزشتہ صدی کے وسط تک کے درمیانی عرصے کا سارا سرمایہ
افتخار زمانے کے تغیر و تبدل اور شکست و ریخت کی نذر ہو کر گم ہو گیا کہ اب اس کا نشان بھی
باقی نہیں رہا۔ یہ بات بھی قرین قیاس ہے۔ کیونکہ پوری معلوم تاریخ میں اس خطے پر بیرونی
حملہ آوروں اور درون خطہ سے آنے والوں کے مختلف قبیلوں کے درمیان جدال جاری
دکھائی دیتا ہے۔ شہری اور دیہی کشاکش، حملہ آوروں کی چیرہ دستیاں، نو آبادکاروں کے
قافلے، ایک تواتر کے ساتھ آتے رہے اور جب دو مختلف تہذیبوں، سماجوں اور ثقافتوں
میں کشمکش ابھرتی رہی، تو انہدام و تعمیر کا عمل بھی ساتھ ساتھ جاری رہتا ہے۔ اگر ایک نظر
ہندکو کے بڑے مرکز پر آنے والے آبادکاروں کے نسبتی دروبست کو دیکھیں تو شاید ہی کوئی
نام ایسا ہو، جس کی نسبتی وابستگی اس خطے سے یا اس کی قدامت سے جڑی نظر آئے۔ یہ
لوگ کہاں کہاں سے آئے اور اس تہذیب کا حصہ بن گئے یہ اہل فارس ہیں، اہل عرب
ہیں، افغان ہیں، غزنوی، قزلباش، سید، اعوان، کشمیری خواجگان، بخاری، صدیقی، زیدی
بھیروی، پنجابی اور پھر سرحد کے مختلف علاقوں سے اس ثقافتی خطے میں داخل ہونے والے
مہمند، آفریدی، بنگش، محسود، خٹک اور دیگر قریبی اقوام کی آمد اور ایک دوسرے میں ضم
ہونے کے بعد کیا قدیم زبان محفوظ رہ سکی ہوگی؟ یہ قدرت کا اصول ہے کہ مختلف تہذیبیں

Scanned by CamScanner

ایک دوسرے میں ضم ہوتیں اور نئی شکل اختیار کرتی ہیں

یقیناً قافلہ در قافلہ اس تہذیب و تمدن کا حصہ بننے والے لوگ اپنے ساتھ اپنی تہذیب و ثقافت، زبان و رسم و رواج ساتھ لے کر آئے ہوں گے۔ جن کے گہرے اثرات موجود زبان کی توڑ پھوڑ اور از سرنو تعمیر و تشکیل میں اپنا کردار ادا کرتے رہے ہوں گے ، چنانچہ پرانی تہذیب وتمدن، زبان اور سرمایہ ادب کا دست برد زمانہ ہو جانا بعید از قیاس نہیں؟ خطہ ارضی اور تاریخ و تہذیب میں آباد دیگر علاقوں اور اقوام کے ساتھ بھی یہ عمل بار بار ہوا، اور ہوتا رہا تو کیا ہندکو کے ساتھ بھی یہی نہیں ہوا ہوگا؟

عزیز سکالرز! آپ ہندکو اور دیگر پاکستانی زبانوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے جا رہے ہیں۔ آپ کے سامنے بہت سے سوال آئیں گے۔ آپ کو یہ بھی دیکھنا ہے کہ ہندکو زبان و ادب کے ساتھ کیا بیتی۔ آپ جانتے ہیں کہ تحقیق کھوئے ہوؤں کو ملانے کا بہترین ذریعہ ہے چنانچہ از سرنو دیکھنا ہوگا کہ ہندکو کا جواز وجہ تسمیہ قدامت زبان کا سرمایہ افتخار تاریخ کے کن ادوار میں کھو گیا۔

ادب کی طرف آتے ہوئے ایک اور بات۔۔ ہندکو لسانیات کے ماہرین نے یہ رائے بھی دی ہے کہ پنجابی اور اردو کا سرچشمہ ء حیات ہندکو زبان ہے۔ یقیناً دعوی کرنے والوں کے پاس اس کا جواز بھی ہے۔ اس ضمن میں فارغ بخاری (ادبیات سرحد)، مختار علی نیر (تاریخ زبان و ادب ہندکو)، خاطر غزنوی (اردو کا ماخذ ہندکو) صابر حسین امداد (ہندکو زبان تے اس دا ماخذ) اورش شوکت (ہندکو زبان و ادب دا تاریخی جائزہ) میں یہ دعاوی بلند آہنگ ہیں۔ کچھ اور اہل قلم نے بھی یہی بات کی ہے۔ لیکن جب آپ اعلی سطح پر زبان و ادب کا موازنہ کرتے ہیں تو آپ کو ہندکو زبان کی نسبت اردو اور پنجابی بہت آگے نظر آئے گی اردو کی بات تو الگ ہے کہ اس کی تعمیر و ترقی میں تمام علاقوں کے لوگوں نے برابر کا حصہ لیا ہے، ہندکو زبان پنجابی کے برابر بھی نظر نہیں آتی کیونکہ پنجابی کے عربی الفبائی نظام اختیار کرنے سے بہت قبل پنجابی گورمکھی رسم الخط میں دکھائی دیتی ہے۔ ایک مختصر سا

Scanned by CamScanner

جائزہ بات کو سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے۔ مثلاً

پنجابی کی پہلی طبع شدہ کتاب ۱۸۷۷ء میں بائبل سوسائٹی کی جانب سے "بائبل دیاں کہانیاں" کے نام سے سامنے آئی، جبکہ ہندکو کی پہلی کتاب ہندکو رائٹرز سوسائٹی نے ۱۹۶۵ء میں "نویاں راواں" کے نام سے شائع کی۔ اسے فارغ بخاری نے مرتب کیا اور اسی سال دوسری کتاب "ہندکو نثر دی کہانڑیں" مختار علی نیر نے شائع کی۔

پنجابی میں تنقید کا آغاز ۱۹۲۳ء میں باوا بدھ سنگھ کی کتاب "پریم کہانی" کی طباعت سے ہوا جبکہ ۱۹۵۳ء میں ہندکو کا پہلا مضمون رضا ہمدانی کے نام سے پنج دریا کراچی میں سامنے آیا۔

پنجابی شاعری کا آغاز ۱۲ویں صدی میں بابا فرید کے نام سے ہوا جبکہ غلام محمد مائیو کے حوالے سے ہندکو شاعری کا ۱۸ویں صدی میں طلوع ہوا۔

فارسی رسم الخط میں پہلا پنجابی افسانہ جوشوا فضل الدین نے ۱۹۲۴ء میں لکھا۔ جبکہ ہندکو میں ۱۹۶۲ء کے بعد روزنامہ انجام میں فہمید آتش نے تحریر کیا۔

پہلا ناول پنجابی میں ۱۸۹۷ء میں سندری کے نام سے طبع ہوا جبکہ ہندکو میں "حق باہو" حسام حر نے ۱۹۹۶ء میں لکھا اور شائع کیا۔

پنجابی ڈراما بھائی ویر سنگھ نے ۱۹۱۰ء میں لکھا اور ہندکو میں مختار علی نیر نے ۱۹۵۳ء میں تحریر کیا۔ ۱۹۸۸ء تک پنجابی میں ۱۱۲ ڈرامے اور ڈرامے کی ۳۵ کتابیں شائع ہوئیں جبکہ ہندکو میں لکھے جانے والے ڈراموں کی تعداد معلوم نہیں لیکن ۲۰۰۴ء میں ناصر علی سید کی ٹی وی ڈرامے کی پہلی کتاب زندگی کے نام سے طبع ہوئی۔

آپ کے سامنے یہ مختصر جائزہ اس لیے پیش کیا ہے تاکہ آپ ہندکو کی قدامت کے ساتھ اس میں موجود سرمائے کا جائزہ بھی لے سکیں اور اس بات پر غور کریں کہ پڑوسی زبانوں کے مقابلے میں ہندکو پیچھے کیوں رہ گئی۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ہندکو کو تحریر کا فن بہت دیر سے ملا اور ایک سوال یہ بھی ہے کہ دیر سے کیوں ملا..... جبکہ اس خطے میں جہاں ہندکو آباد ہے لکھنے کا فن ایک صدی قبل بھی موجود تھا--؟

Scanned by CamScanner

یہ تھیں زبان کے حوالے سے چند باتیں ۔ اب ہندکو ادب کی طرف آتے ہیں۔

کسی بھی ادب کا جائزہ اس معاشرے کی عوامی دانش (Grass roots intelect) کو سمجھے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ عوامی دانش سماجی زندگی کے بہت سے پہلوؤں کو ابھارتی ہے اور سماجوں کا یہی رنگ اس خطے میں میں بسنے والوں کی سماجی اور علمی ثروت کی دلیل بنتا ہے۔ بہت سے رنگوں میں سے لوک ادب ایک نہایت معتبر حوالے کا درجہ رکھتا ہے۔ کسی بھی زبان، ثقافت، تہذیب اور ادب کی شکوہ کا اندازہ اس کے لوک ادب میں پنہاں ان زول اور سجل جذبوں سے ظاہر ہوتا ہے جو Grass root intelect کی زمین پر خود رو پودوں کی طرح اگتے اور خوشبو کی طرح نسل در نسل پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اس کاغذ کے محتاج نہیں ہوتے، جسے بالآخر خستگی کا شکار ہونا ہوتا ہے بلکہ یہ ہمیشہ زندہ رہنے والی ڈھرکنوں اور سانس کی ڈوریوں میں پروئے ہوتے ہیں جسے ہر زمانہ آنے والے عہد کے سپرد کر کے عوامی دانش کا بھرپور اظہار کرتا ہے۔ ہم لوک ادب کو گزرے زمانوں کے اجتماعی لاشعور کا نام بھی دے سکتے ہیں کہ یہ ورثہ عوام کے اجتماعی جذبوں کا ترجمان ہوتا ہے اور اسے وجود میں لانے کے لیے کسی شعوری کوشش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جیسے غم اور خوشی غیر ارادی افعال ہیں، اسی طرح ان غموں اور خوشیوں سے پھوٹنے والا لوک ادب بھی کسی ارادی کاوش کا محتاج نہیں ہوتا۔ لوک ادب کا ایک اور پہلو بھی ہے جسے میں پروفیسر شریف کنجاہی کی زبان میں بیان کرتا ہوں:

> "ان گیتوں کے بارے میں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ گیت اونچے خاندانوں اور معاشرے کے اعلیٰ طبقے کے بارے میں ہمیں کوئی معلومات مہیا نہیں کرتے۔ ان کا تعلق معاشرے کے متوسط اور نچلے طبقے سے ہے۔"

ہندکو ادبیات کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ اس کے عوامی جذبوں کی کینوس پر لوک ادب کے رنگا رنگ شاہکار سجے ہوئے ہیں۔ سید فارغ بخاری نے لوک شاعری کے حوالے

Scanned by CamScanner

سے بڑی تفصیل سے بات کی ہے انھوں نے لوک شاعری کی ۴ قسمیں گنوائی ہیں۔ ان میں سے ٹھنی، ترنگی اور مستا شاعری بیاہ کے گیت ہیں جبکہ انیتی نوجوان لڑکیوں کے جذبات کا اظہار ہے۔

پرکھ شاہ دولہ لوک رقص ہیں۔ ہندکو لوک کہانیوں کو ممتاز محقق مختار علی نیر نے جمع کر کے شائع کیا۔ اس میں ۱۶ لوک کہانیاں ہیں۔ کہانیوں کے ساتھ مختار علی نیر کا حسن انتخاب اور سرورق بھی داد طلب ہے۔ لوک ادب کا ایک اور موثر رنگ ضرب الامثال اور محاوروں سے ابھرتا ہے۔ ہندکو ادبیات اس سرمائے سے بھی بھرا پڑا ہے۔ ہندکو کے مختلف قلم کاروں نے لوک ادب کی ان اصناف کی جمع آوری اور ترتیب و تزئین میں خاصا کام کیا ہے۔

شاعری، موسیقی اور انسان ابتدائے آفرینش سے ایک دوسرے سے اس طرح بندھے ہوئے ہیں کہ اس تثلیث کے کسی ایک زاویے کی کمی دوسرے کو ادھورا کر دیتی ہے۔ یوں لگتا ہے، جیسے انسان کے خمیر میں ایک ردم Rhythm گندھا ہوا ہے۔ جس نے انسان کی ذات کا روپ دھار کر اسے ایک فطری آہنگ کی میراث سے ہم آمیز کر دیا ہے۔ شاید اسی لیے اولین انسان نے دیوتاؤں کے خوشنودی اور Submition کے لیے شاعری اور موسیقی کا سہارا لیا، چونکہ انسان کی ذات میں سب سے اہم صفت یہی آہنگ ہے، چنانچہ اس نے اپنی ذات کے اظہار کے لیے بھی اسی انگ کو استعمال کیا ہے۔ کبھی لفظوں میں بات کی اور کبھی موسیقی کی لہروں میں خود کو ڈھال لیا اور جب کبھی جذبات کی طغیانی زور آور ہوئی تو پاوں میں گھنگرو باندھ کر جسم کے قوس و قزح کے رنگ بکھیر دیے۔ اظہار کی ان تینوں صورتوں میں شعر ارفعیت کا حامل ہے کہ اس میں حد امکاں سے آگے بڑھ جانے کی صلاحیت بدرجہ اتم ہے۔ شاید اسی لیے شیلے نے کہا تھا کہ اب کوئی پیغمبر نہیں آئے گا اور شاعری وصف پیغمبری سنبھال لے گی۔

ہندکو شاعری کا جائزہ لیں، تو ہمیں مایوسی نہیں ہوتی۔ سوا دو سو سال کی تاریخ کے

Scanned by CamScanner

ساتھ شعری رفاقت نہ صرف یہ کہ ایک فطری ارتقاء کا پتہ دیتی ہے، بلکہ اس رنگ، ڈھنگ اور آہنگ سے رستاخیز بھی ہے جو اظہار کی معنویت کو شعری حسن کی تزئین سے آراستہ کرتی ہے۔ اگرچہ ہندکو شاعری بلکہ پورے ہندکو ادب کو تحریر کی سہولت گزشتہ صدی کے آخری نصف میں نصیب ہوئی، مگر مخطوطوں اور اور بیاضوں کی صورت شاعری کے تسلسل اور شاعروں کا پتہ دیتی ہے اور قدیم شاعری کی عظمت سے روشناس کراتی ہے۔

ہر زبان کی طرح ہندکو شاعری کے قدیم نمونے بھی مذہبی اور اخلاقی مضامین میں ملتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ ذات بھی اس کا حصہ بننے لگی اور پھر یہ مضامین پھیلتے ہوئے پوری زندگی کا احاطہ کرنے لگے۔ جذباتی زندگی سے لے کر سماجی زندگی تک ایک تسلسل قائم ہو گیا اور اس طرح ہندکو شاعری نے اپنا وہ مقام پا لیا، جو کسی بھی زبان کی قابل اعتناء شاعری کا خاصہ ہوتا ہے۔

سید فارغ بخاری نے اپنے مضمون ہندکو ادب (مطبوعہ تاریخ ادبیات مسلماں پاکستان و ہند جلد ۱۴۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۷۲ء) میں شاعری کے ضمن میں مرزا عبدالغنی کی بیاض کے حوالے سے ۱۷ شعرا کا ذکر کیا جو اٹھارویں اور انیسویں صدی سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ وہی مرزا عبدالغنی ہیں جن کا ذکر لنگوسٹک سروے آف پاکستان کے مصنف گریرسن نے بھی کیا ہے۔ پروفیسر خاطر غزنوی نے ۱۷ کی فہرست میں کچھ ناموں کا اضافہ کیا جبکہ مختار علی نیر نے قدیم شاعری کے ضمن میں ۳۰ شعراء کی فہرست دی ہے۔ فارغ بخاری نے اولین دریافت شدہ شاعر کا نام محمد دین مائیو درج کیا ہے۔ خاطر غزنوی نے اپنے مضمون کا آغاز عیسی خان مشوانی سے کیا، جو پشتو اور فارسی میں بھی لکھتے تھے۔ جبکہ مختار علی نیر نے رحمت خان رحمت کو بطور اولین شاعر تحریر کرتے ہوئے ان کی حیات کو ۱۶۸۰ء-۱۵۹۲ء کے سالوں میں پیش کیا ہے۔ جدید عہد کے حوالے سے نیر صاحب نے ۱۰۰ سے زائد ہندکو میں شعر کہنے والے اہل قلم کا ذکر کیا۔ اس کے باوجود جدید عہد کے نہایت محترم نام بشمول ڈاکٹر نذیر تبسم اور ناصر علی سید اس فہرست میں دکھائی نہیں دیتے۔

Scanned by CamScanner

اگر ہم ہندکو شاعری کے موجودہ عہد کا جائزہ لیں، تو خوشگوار حیرت ہوتی ہے کہ ہندکو شاعری جو صدیوں میں گنتی کے ناموں سے آگے نہیں بڑھی ہے جدید عہد میں پہنچ کر صرف بے شمار ناموں کا اضافہ کر چکی ہے بلکہ موضوعی اعتبار سے بھی ذات کے تنگنائے سے نکل کر کائنات کی وسعتوں تک پھیل چکی ہے۔ آج کی ہندکو شاعری یقینی طور پر موجودہ عہد کی معاشرتی، معاشی، تہذیبی اور نفسیاتی زندگی کا احاطہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

ہندکو کی پہلی طبع شدہ کتاب شاعری کا انتخاب نویاں راواں کے نام سے ۱۹۶۵ء میں فارغ بخاری نے مرتب کر کے شائع کیا تھا اور پھر ان نئی راہوں پر چلتے ہوئے جدید عہد کے شاعروں نے اپنے دیوان سجا دیے۔ حرفی، چار بیتہ، سٹھنریوں کی جگہ ۱۹۷۰ء کے بعد دیگر اصناف سخن غزل، نظم، قطعے نے لے لی تھی اور اس اجتہاد کے لیے رضا ہمدانی کا نام سر فہرست ہے.....، چنانچہ ۱۹۷۰ء کے بعد آنے والے شعری مجموعوں میں غزل کی برتری واضح دکھائی دیتی ہے۔ قابل ذکر مجموعوں میں:

مٹی دے بت	(آغا محمد جوش)
مینا تے جام	(آغا محمد جوش)
نویاں راواں	(مرتب فارغ بخاری)
کالی تہپ	(سید فارغ بخاری)
مٹھے ڈنگ	(رضا ہمدانی)
ترمے ترمے	(رضا ہمدانی)
لیکھ	(تاج سعید)
کھورے سچ،	(صابر حسین امداد)
سچ دا زہر اور	(صابر حسین امداد)
سچ دے دیوے	(صابر حسین امداد)
پھل تے کنڈے	(پرواز تربیلوی)

Scanned by CamScanner

ککھ تے ککھ	(پرواز تربیلوی)
پیار پبلیکھے	(یحییٰ خالد)
تارا دیرہ، بول ملنگا	(مقبول اعجاز اعجازی)
سنہہ سویل،	(محمد فرید)
چٹے نقطے	(محمد فرید)
چپ تماشا	(محمد فرید)
تصویراں	(ثریا حسام حر)
چلکاں	(پروفیسر بشیر احمد سوز)
دل دے ہتھوں	(ناز سیٹھی)
سکی معتبری	(شریف حسین شاہ)
الارے	(فقیر حسین ساحر)
سوچاں تے جگراتے	(منیر حیدر)
اوبلے خواب خیالاں	(آصف ثاقب)
تارولوئی والا	(آصف ثاقب)
آبشار	(مضمر تاتاری)
حسد ے غم	(اسلم طارق)
سنا شہر تے ٹھبڈی تہپ	(ساحر مصطفائی)

اور کئی دیگر مجموعے شائع ہوئے جن میں چند مرتب شدہ درج ذیل اہم ہیں:

دیوان گھائل	(ڈاکٹر الٰہی بخش اختر اعوان)
میناتے جام آغہ جوش	(مرتبہ: زیڈ آئی اظہر)
مٹی دے بت آغہ جوش	(مرتبہ ظفر مہدی)
سوداگر اس بازار دا	(حیدر زمان حیدر)

Scanned by CamScanner

سائیں احمد علی پشوری (رضا ہمدانی)

کل تے اج، جلیل احمد کمال (مرتبہ نسیم سحر)

مثال انتخاب (حیدر زمان حیدر)

تراجم میں:

حرف اقبال (مترجم حسام حر)

ڈیفوڈل سی موتیے تک (مترجم ملک ارشد حسین)

ہندکو شاعری کا یہ سرمایہ آج ہندکو کے لیے افتخار بن چکا ہے۔

اگرچہ ہندکو ادب کو طباعت کی سہولت بہت دیر سے ملی۔ تاہم نصف صدی سے بھی کم عرصے میں ہندکو افسانے نے اپنے اس معیار کو پالیا ہے، جو ادب کی ارفعیت قائم کرتا ہے اور جو اس کے پڑوس میں آباد زبانوں کو حاصل رہا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہندکو کے ابتدائی افسانے بھی اپنے معیار اور موضوع کے حوالے سے اہم افسانوں کی صف میں دکھائی دیتے ہیں۔ اگرچہ ابتدائی افسانے روایت کے رنگ میں بھی ہیں، لیکن جدید افسانے کا انداز اختیار کرنے میں ہندکو افسانے کو زیادہ دیر نہیں لگی۔

برصغیر میں افسانے کی تاریخ اگرچہ قدیم نہیں، لیکن اس کے آثار ۱۹ویں صدی میں ہویدا ہونا شروع ہوگئے تھے۔ جس طرح قدیم عربی میں نظم و قصیدہ کے آغاز میں میں تشبیب بلا نام کے غزل کے روپ میں شامل ہوا کرتی تھی اور بعد ازاں فارس میں ممتاز شاعر رودکی کے ہاں پہنچ کر غزل کا نام پا گئی۔ اسی طرح داستانوں سے لے کر فسانہ آزاد تک میں افسانے کی آثار دکھائی دیتے ہیں .....پھر ۲۰ ویں صدی میں پریم چند کے ہاں پہنچ کر ایک مکمل صنف کے طور پر نمایاں ہوئے۔ پریم چند کے ہاں فنی تکنیکی اور موضوعی maturity یہ بتاتی ہے کہ پریم چند کے سامنے افسانہ کا نمونہ داستانوں میں پہلے سے موجود تھا جسے پریم چند نے ایک الگ شکل دی جو آگے بڑھتی ہوئی اردو ادب کی نہایت موثر صنف ثابت ہوئی۔

Scanned by CamScanner

اردو افسانے کے اثرات دیگر مقامی زبانوں پر بھی پڑے اور تکنیک، ہیت، ڈکشن، اسلوب اور پیش کش کا جو ترقی یافتہ انداز اردو میں موجود تھا۔ جلد ہی اس سے مقامی زبانوں نے کسب فیض کیا اور انھیں ترقی کے دور سے گزرنا نہیں پڑا بلکہ انھوں نے نہایت آسانی کے ساتھ ایک مکمل افسانہ پیش کر دیا۔

ہندکو افسانے کو بھی یہی سہولت حاصل تھی۔ اردو اور پھر پشتو افسانہ سامنے تھا، ہندکو لوک ادب میں کہانی کی صوری اور معنوی تشخص بھی موجود تھا۔ چنانچہ آغاز ہی میں ہندکو کہانی ترقی یافتہ، تکنیک، اسلوب، ہیئت اور ڈکشن کے ساتھ سامنے آ گئی۔ موضوع کے اعتبار سے بھی اس نے اردو کے افسانے جیسی رفعت پا لی تھی۔ جہاں سماجی جذبات نگاری سے لے کر زندگی کے سنجیدہ اور رنجیدہ موضوع اس کے قالب میں ڈھالنے لگے تھے۔ اس طرح آغاز میں ہی ایک مکمل کہانی کا وجود پا لیا۔

یہاں ایک بات قابل توجہ یہ ہے کہ مغرب کی نسبت مشرقی تہذیب میں کہانی اور انسانی رشتہ زیادہ مربوط اور مضبوط ہے۔ مشرقی بچے کا تعلق کہانی کے ساتھ بچپن سے ہی جڑ جاتا ہے۔ لیکن ہندکو تہذیب کے گہوارے میں پلنے والے بچے کو یہ تخصص بھی حاصل ہے کہانی کاری اس کی ماں کی گود سے قصہ خوانی بازار تک ہر جگہ اور عمر کے ہر حصے میں اس کے ساتھ رہتی ہے۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ کہانی کی دلچسپیوں کے ساتھ کہانی کی تہذیب و تزئین کا شعور بھی اس میں ارزانی ہے ہندکو رہتل کے حوالے سے جو کہانی وہ بچپن سے سنتا ہے وہ اس کی تربیت کا حصہ بن کر ساری زندگی میں اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ لہذا ہندکو ادب میں مضبوط کہانی کاری کا چلن ماں کی میٹھی آواز کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ اس کی ایک دلیل ہندکو کے شائع ہونے والے افسانوی مجموعوں سے دی جا سکتی ہے۔ ہندکو میں اب تک افسانوں کے شائع ہونے والے سات مجموعوں میں سے چھ کا انتساب ماں کے نام ہے۔ شاید یہ ماں کی میٹھی آواز کا قرض اتارنے کی ایک صورت ہے۔

ہندکو افسانے نے کب آنکھ کھولی یہ تو اب تک نہیں کھل سکا، تاہم روزنامہ انجام

Scanned by CamScanner

پشاور نے جب ۱۹۶۰ء کے بعد ہندکو صفحے کا آغاز کیا، تو جوہر میر جو ان دنوں انجام سے وابستہ تھے۔ ہندکو ادبی صفحے کے انچارج بن گئے، بظاہر یہ ایک ادبی صفحے کا اجراء تھا، مگر ہندکو ادبیات کو ہی نہیں اردو زبان کو Break Through مل گیا تھا۔ وہ زبان جو اب تک معلق زبان تھی۔ اس کے پاؤں زمین پر آن لگے۔ جب کسی زبان کو زمیں ملتی ہے، تو وہ چھ ابعاد میں پھیلتی ہے۔ اگر زمین نمدار ہو تو تیزی کے ساتھ جڑیں مضبوط کرتی اور اسی تیزی کے ساتھ بیج سے پودا اور پودے سے درخت بن جاتی ہے۔ انجام کا یہ ادبی صفحہ اور جوہر میر کا Initiative زبان ہندکو کے لیے جہان تازہ کی نوید لے کر آئے اور دیکھتے دیکھتے شاعری کے ساتھ ساتھ افسانہ، کالم، ترجمہ اور ادب کی دیگر اصناف منصۂ شہود پر آنے لگیں۔ اگرچہ اس صفحے کے انچارج جوہر میر تھے مگر ترتیب، تزئین کے لیے ان کی رہنمائی مختار علی نیر اور سعید گیلانی کرتے رہے تھے۔ آغاز میں شاعری کے ساتھ کچھ نوجوانوں نے ہندکو میں ترجمے کا آغاز کیا۔ مگر جلد ہی ہندکو کا طبع زاد مواد بھی چھپنے لگا۔ اس صفحے پر چار کالم شائع ہوتے، جو جوہر میر، مختار علی نیر اور ان کے رفقاء لکھتے۔ اسی دور میں مختار علی نیر کے ایک ڈرامے "موت کا رقص" کو جوہر میر نے ترجمہ کر کے ہندکو میں "بوئی جی" کے نام سے شائع کیا چنانچہ ہندکو کے تحریری سرمایے میں ترجمے کے حوالے سے اس ڈرامے اور مترجم کے طور پر جوہر میر کو اولیت حاصل ہوئی۔

پھر وقت کے ساتھ انجام کے ادبی صفحے پر کچھ نئے نام نظر آنے لگے جو مضامین اور افسانوں کے حوالے سے تھے۔ ان میں آتش فہمید، جہانگیر تبسم، نذر حسین شاد، صادق شاہ رعنا، جوہر میر، نیر صاحب، رضا ہمدانی، اسمعیل اعوان اور کئی نئے اور پرانے نام ایک ساتھ تھے۔

اس آغازیہ کا اختتام یہاں کرتے ہیں کہ انجام کے ہندکو ادبی صفحے سے ہندکو تحریر کا جو ڈول ڈالا اس نے ہندکو زبان کو دیکھتے ہی دیکھتے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اور ہندکو نثر، خصوصاً افسانہ لکھنے والوں کے چند نام بھی دکھائی دینے لگے۔ ان میں آتش فہمید

Scanned by CamScanner

وہ نام ہے۔ جنھوں نے ہندکو ادب میں پہلے افسانہ نگار کا نام پایا۔ ان کے بعد دوسرا نام جہانگیر تبسم کا ہے جب کہ ان کے ساتھ ہی ایم اسمٰعیل اعوان تھے۔ جنھوں نے ہندکو افسانہ لکھتے ہوئے بالآخر "دکھ سکھ" (جہانگیر تبسم) اور میری ہندکو کے نام سے (اسمٰعیل اعوان) نے افسانوی مجموعہ بھی دیا۔

آتش فہمید کے افسانے سماجی زندگی اور پشاوری ثقافت کے عکاس ہیں۔ اگرچہ اس وقت تک موجودہ عہد کی افراتفری سے ہندکو افسانہ ناشناس تھا۔ مگر سیاسی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلیوں نے اردو افسانے کو ارتقا کی منزلوں سے آراستہ کر دیا تھا چنانچہ معاشرتی تبدیلیوں کے ساتھ افسانہ بھی ایک انقلاب آفرین جست بھر گیا۔ اسی تسلسل میں اردو افسانے کی غیر معمولی قلب ماہیت نے پاکستان کی دیگر زبانوں اور اذہان کو بھی متاثر کرنا شروع کر دیا اگرچہ اردو افسانے کے یہ اثرات براہ راست نہ تھے اور ہندکو افسانے کے تجربے کا حصہ نہ بن پائے تھے، تاہم زندگی کی تبدیل ہوتی قدروں سے ایک حد تک سرحد کے ذہن نے بھی اثر قبول کیا۔ آتش فہمید کے افسانے اس تپش کو محسوس کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا افسانہ ''لال بوٹ'' اس لحاظ سے جداگانہ اور ممیز ہے کہ اس میں اظہار کی شدت مقصدی نیابت فکر میں المیاتی صورت حال کو خلق کرتی ہے۔ اگرچہ افسانے کا کینوس تین نسلوں تک پھیلا ہوا ہے، لیکن افسانہ نگار کی گرفت مضبوط ہونے کے سبب ایک ایسی فضا کی تخلیق ہوتی چلی جاتی ہے جس میں تین نسلوں پر زمانے کے اثرات ایک تسلسل اور واقعاتی جواز کے ساتھ ترتیب پاتے ہیں۔ سجاد کے بچے کی چھوٹی سی خواہش اور گھات لگائے موت کی ستم ظریفی قاری کو ایک منطقی انجام تک پہنچاتی ہے۔ تاثر اور شدت احساس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ یہ افسانہ پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ آتش فہمید بات کرنے کے سلیقے سے بہرہ مند ہے۔

محمد جہانگیر تبسم کو یہ شرف حاصل ہے کہ انھوں نے آغاز میں اس وقت اس سمت قدم رکھا، جب ہندکو نثر قحط کا شکار تھی۔ تاہم آتش فہمید کے ساتھ ان کا نام بھی اولین لکھنے

Scanned by CamScanner

والوں میں آتا ہے۔ پروفیسر خاطر غزنوی کہتے ہیں (ترجمہ)

"جہانگیر تبسم کا دوسرا کارنامہ اس زندگی اور متعلقات زندگی کا گہرا مشاہدہ ہے۔ اس نے اپنے سماج کا بھرپور مطالعہ کیا ہے۔ گھریلو جھگڑے، غلط رسوم، جھیڑیاں، قدماں، انسانی نفسیات اور معاشرے کے واقعات و حادثات کی تصویریں اتاری ہیں۔"

جہانگیر تبسم کے افسانوں کا مرکزی خیال معاشرتی کشمکش اور ان تضادات پر استوار ہے جس نے معاشرے کے خدوخال بگاڑ کر اسے کچلا دیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے دکھوں اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں کی بنیادوں پر کھڑے اس کے افسانوں نے فنی، تکنیکی، اسلوبیاتی اور موضوعی اعتبار سے ہندکو افسانے کو آغاز میں ہی اپنے پیروں پر کھڑا کر دیا تھا۔ اس کی ایک مثال اس کا افسانہ "دو اتھرو" ہے۔ گھریلو زندگی میں رونما ہونے والے بعض نہایت معمولی واقعات زندگی کا روگ اور چھوٹی سے خواہش سوہان روح بن جاتی ہے۔ صفیہ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ اپنی شادی کی دسویں سالگرہ کی تقریب منعقد کرے۔ اس کا خاوند اعجاز فورا راضی ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے گھر والے مزاحم نہ ہونے کے باوجود طعنے اور طنز سے اسے کچوکے لگاتے ہیں۔ سارے عزیز و اقارب آتے ہیں، اس کی ماں بھی شریک ہوتی ہے۔ تقریب کی اختتام پر جب وہ کمرے میں آتی ہے، تو اس کا خاوند اسے بتاتا ہے، کہ اس نے سارے تحفے گھر والوں میں بانٹ دیے ہیں اور پھر کہتا ہے، کہ تمہاری ماں خالی ہاتھ آئی تھی، تمہاری عزت کیا رہ جائے گی۔ یہ سن کر اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے ہیں۔

یہ افسانہ بظاہر چار پانچ صفحوں پر محیط ہے، مگر انسانی سائیکی کی پوری دنیا اس میں سمٹ آئی ہے۔ ایک اچھوتی سی خواہش کی سزا زندگی پر پھیلتی محسوس ہوتی ہے۔ اور ایک شدت غم ابھرتی ہوئی ساری فضا پر محیط ہو جاتی ہے جہانگیر تبسم کو کردار سازی اور فضا کی تشکیل پر بڑی قدرت حاصل ہیں ان کی کرافٹ شپ خوب ہے۔

Scanned by CamScanner

آغاز سفر کا ایک اور معتبر نام ایم اسمعیل اعوان کا ہے جن کی ابتدائی تخلیقات تو ۱۹۶۰ء کے بعد روزنامہ انجام پشاور کے ہندکو صفحے سے منصۂ شہود پر آئیں مگر ان کے ادب کی پختگی اور پرکاری یہ بتاتی ہے کہ انہیں فن پر ایک کمال گرفت حاصل ہے۔ اگرچہ انہوں نے نظم و نثر دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی مگر نثر اور خصوصاً افسانہ نگاری میں مہارت اور پیشکش میں حسن اختصار، اور بیانیہ کے فنی اعجاز کا گواہ بھی ہے اور ان کی اصل فیلڈ کی نشاندہی بھی کرتا ہے..... ان کی کہانیاں پڑھنے والے کو اس طرح گرفت میں لے لیتی ہیں کہ کہانی ختم کیے بغیر کتاب رکھنا آسان نہیں رہتا۔ کہانی کی بنت کاری اور کرافٹ شپ پر ان کی قدرت اس بات پر دال کرتی ہے کہ انہیں جدید عہد کی نفسی ماہیت کا ادراک ہی نہیں معاشرتی در و بست سے بھی کماحقہ آگاہی ہے۔ اسی لیے یہ احساس ارزانی ہے کہ اسمعیل اعوان نے آغاز میں ہی کہانی کو جوان کر دیا تھا۔ یہ خیال اس لیے بھی آیا ہے کہ ان کی کہانوں میں ایک زندہ عہد اور اس کی جدلیات اپنی پوری سلامیت، مکمل قرینے اور سلیقے کے ساتھ سموئی ملتی ہیں۔انہیں نہ صرف فکر سے واقعت تک حسن ترتیب بلکہ لفظیات کے چناؤ کا فن بھی آتا ہے۔ ان کے افسانوں میں کسی اختصاصی واقعے یا مقصد کی نیابت پیشکش کے دوران تاثر کو مجروح نہیں کرتی کہانی کی توقیر بڑھا دیتی ہے اس کا افسانہ ''نیکی'' اس کا بہترین ثبوت ہے.....

''نیکی'' کی ہیروئن طوائف ایثار اور قربانی کے جذبے کی نمائندگی کرتی ہے اور جواب میں اسے وہی روایتی ذلت آمیز بے توقیری ملتی ہے۔ اگرچہ موضوع کے اعتبار سے یہ احتمال رہتا ہے کہ دونوں کہانیوں میں یکسانیت کے سبب ''نیکی'' کہیں منٹو کے ''موذیل'' کی آغوش میں نہ جا بیٹھے یا طوائف کا رویہ اسے غلام عباس کی ''آنندی'' کے قریب نہ کر دے، مگر اسمعیل اعوان کی بنت کاری، کرافٹ شپ اور مہارت نہ صرف اپنی کہانی کو دونوں افسانوں کے قرب سے بچالیتی ہے بلکہ اسے روائتی در و بست میں ایک تیسرے انجام سے ہم آمیز کر دیتی ہے۔ ان کی کرافٹ شپ کا ایک اور مظاہرہ ان کی کہانی

Scanned by CamScanner

"بابو" میں نظر آتا ہے مگر موضوع کی تنگی اسے بڑا افسانہ بننے میں مانع رہی ہے تاہم کہانی کی نشست و برخاست، فنی ترتیب اور نفیس لفظیات کہانی کے گراف کو نیچے نہیں گرنے دیتی اسمٰعیل اعوان ایک صاحب اسلوب کہانی کار ہے۔ ان کے تازہ مجموعے "میری ہندکو" سے گزشتہ برس ہندکو بورڈ نے شائع کیا اس کا دیباچہ اردو اور ہندکو کے ممتاز شاعر نجاد بابر نے عکس و شخص کے حوالے سے تحریر کیا وہ اسمٰعیل کو سمجھنے میں مددگار ہے۔

افسانے کے حوالے سے جوہر میر کا نام بڑا اہم ہے۔ اردو اور ہندکو دونوں زبانوں پر مکمل دسترس کے ساتھ مختلف اصناف کے اظہار میں بھی یکتائے روزگار ہے۔ انجام کے ہندکو صفحے کی ادارت سے آغاز کیا۔ شاعری، افسانے، کالم، سیاسی تبصرے، ترجمے اور ڈرامے لکھے۔ اسے ہندکو ڈرامے کے پہلے مترجم ہونے کے ساتھ ساتھ پہلا ٹی وی سیریل لکھنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ ہندکو میں ڈرامے کے سلسلے میں یہ پہلی طویل تحریر تھی جس سے لکھنے اور پڑھنے والوں کے دلوں سے ہندکو کی ثقالت کا خوف دور کر دیا..... اس ٹی وی ڈرامے کو ناظرین نے بڑا پسند کیا۔ اردو میں شاعری، افسانے، ناول، کالم، ڈرامے، سیاسی تبصرے اور صحافت کے حوالے سے ان کی آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جس میں سے ایک اردو افسانوں کا مجموعہ زباں بریدہ اور دو ناول رنج رائیگاں ناول بھی شامل ہے.....

ان کے افسانون کا موضوعی دائرہ جبریہ قوتوں کے خلاف جہاد کا درجہ رکھتا ہے۔ پشاور کی مخصوص سماجی زندگی اور زندگی کے تضادات ان کے افسانوں میں حقیقت نگاری کی ایک ارفع مثال قائم کرتے ہیں۔

حسام حر ایک جید ہندکو ادیب ہے۔ کچھ لوگوں نے جن میں مختار علی نیر، اورنگ زیب غزنوی، صابر حسین امداد، ش شوکت، خاطر غزنوی اور کئی نام شامل کیے جا سکتے ہیں۔ اپنی زندگیاں ہندکو کے لیے وقف کر رکھی ہیں۔ حسام حر کا نام ان میں اس لیے بھی اہم ہے کہ اس نے ہندکو کی تمام اہم اصناف میں سب سے پہلے کتب پیش کیں اور اس کے ساتھ اردو شعر و ادب میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ہندکو افسانوں میں اپنی کتاب "نکی جئی گل"

Scanned by CamScanner

شائع کر کے اولیت پائی۔ پھر خاکہ نگاری کی کتاب "ہسدے وسدے لوک" ۱۹۹۴ء میں پیش کر کے اولین قدم رکھا۔ ہندکو زبان کا قاعدہ ترتیب دیا۔ ہندکو رسائل طبع کیے۔ ہندکو اخبار نکالا، الغرض ہندکو کا یہ مجاہد یقینی طور پر تحسین کا حق دار ہے کہ اس کی زندگی کا بڑا مقصد ہی ہندکو کی پروموشن ہے۔

ہندکو افسانے میں حسام حر نے سادگی اور پرکاری کا نیا جوہر دکھایا ہے۔ اس کے افسانے زندگی سے اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ زندگی میں افسانہ اور افسانے میں پوری زندگی دکھائی دیتی ہے۔ وہ افسانے کا ایک سچا لکھاری ہے۔ کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے اس نے قدیم عہد کے قصہ گو کا منصب سنبھال لیا ہے، جو دیکھ رہا ہے، کہہ رہا ہے۔ جو کہہ رہا ہے وہ سماج میں ہو رہا ہے..... لیکن اس کی کہانی سالوں، صدیوں پر نہیں پھیلتی، ایک لمحے میں جنم لیتی اور اگلے لمحے ختم ہو جاتی ہے۔ یہ جدید عہد کا قصہ گو ہے۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ شہزادے کی پیدائش سے اس کی موت تک ایک ہزار ایک راتوں میں کہانی مکمل کرے۔ نیا عہد لمحوں میں زندہ ہے۔ چنانچہ حسام کی کہانی بھی لمحوں میں جنم لیتی ہے اور اگلے لمحے کلائمکس عبور کر جاتی ہے۔ اس کی "وتھاں پیاں ڈاراں وچ"، "وڈا کارا" اور "کڑیاں بنڑی آرے" بھی لمحے میں جنم لیتی ہیں۔ پہلی کہانی اس کی جذباتی زندگی، دوسری ادبی اور تیسری سماجی زندگی کی نمائندگی کرتی ہیں۔ تینوں کہانیوں میں اس کی بنت کاری، اسلوب اور موضوع اس کے خلوص اور دیانت فکر کا بھرپور اظہار ہے۔ زندگی کا مطالعہ اور اسے من وعن مگر فنی چابکدستی کے ساتھ پیش کرنے کے فن پر حسام مضبوط گرفت رکھتا ہے۔ اسی سبب اس کی آشنا ماحول میں لکھی ہوا قصہ بھی ایک مکمل افسانہ لگتا ہے۔

افسانے کے حوالے سے نسیم جان بھی صاحب کرامت شخصیت ہے۔ اس نے ۱۹۵۶ء سے اردو میں افسانے لکھنا شروع کیے، جو ملک کا ممتاز جرائد میں شائع ہوئے۔ پھر ۱۹۷۰ء کے بعد انھیں ہندکو میں ترجمہ کر لیا۔ اس کی ہندکو زبان پر گرفت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہے کہ اگر وہ خود اس کا اعتراف نہ کرتا کہ بنیادی طور پر یہ افسانے اردو میں

Scanned by CamScanner

لکھے گئے، تو اس کے ہندکو افسانے پڑھتے ہوئے ایسا بھی احساس نہیں ہوتا کہ وہ ترجمہ ہیں۔ چونکہ ان افسانوں کی فضا ہندکو بولنے والے علاقوں اور لوگوں سے لی گئی، چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ افسانوں کو ماحول کے ساتھ زبان بھی وہی مل گئی جو ان کہانیوں کے باطن میں تھی۔ رضا ہمدانی اس ضمن میں کہتے ہیں:

> "نسیم جان نوں اپڑی ماں بولی نال بڑا پیار اے۔ او اردو زبان وچ تا بڑی مدت سی افسانے لکھدا رہیا۔ پر اردو دی ہٹ کے اپنے اپڑی ماں بولی دے دوو دیاں تہارا دا بی حق ادا کر دتے۔ ہندکو زبان کو نسیم جان نے افسانے دی سوغات دے کے وڈا کم کیتا۔"

نسیم جان کے افسانوں کا مجموعہ ''کوک'' ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا اور اس طرح حسام حر کے ہندکو افسانے کی کتاب "نکی جنی گل" (۱۹۹۲ء) کے بعد دوسری افسانوں کی طبع شدہ تصنیف ہے۔

''ہندکو افسانے'' اورنگ زیب احمد غزنوی کا مرتب کردہ مجموعہ ہے۔ جس میں ۱۲ افسانہ نگاروں کے ۲۰ افسانے شامل ہیں۔ ۵ افسانے اورنگ زیب احمد غزنوی کے اپنے اور باقی ہندکو کے ممتاز اور نئے ناموں کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ جن میں ہندکو کے اہم ڈرامہ نگار، شاعر، نثر نگار اور افسانہ کار ناصر علی سید، نذیر بھٹی، حسام حر، ش شوکت، حیدر زمان حیدر، ارشد حسین، مسز صبا جاوید، تنویر احمد خان، ڈاکٹر سعید تبسم، خورشید خان، افتخار احمد تشنہ، سید معصوم شاہ ثاقب، محمد ارشد امین اور مسرت حسین زبیری کے افسانے جلوہ گر ہیں۔ ناصر علی سید اردو اور ہندکو کے شاعر، افسانہ نگار اور ڈرامہ نویس ہیں۔ نذیر بھٹی کو ہندکو ڈرامے میں اہم مقام حاصل ہے۔ اورنگ زیب حر (حسام حر) ہندکو نثر و نظم میں اہمیت کے حامل اور حیدر زمان حیدر ہندکو کا ایک اہم ترین نام ہیں۔ ش شوکت تنقید و شاعری کے ساتھ ناول بھی لکھ رہے تھے، جو اب تک مکمل نہیں ہوا۔ اورنگزیب غزنوی ہندکو ادبیات میں ایک مجاہد کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی زندگی کا اہم مشن ہندکو زبان و ادب کی

Scanned by CamScanner

Projection ہے۔ جس کے لیے انہوں نے اپنی ساری توانائیاں صرف کر رکھی ہے۔ ان کے افسانے بھی ہندکو رہتل کو پیش کرتے ہیں جن میں مقامی تہذیب کا رنگ گہرا اور سماجی زندگی بھی پورا انداز میں سامنے آتی ہے.....

افسانہ لکھنے والوں میں خواتین بھی پیچھے نہیں۔ ثریا حسام حر افسانوں کی کتاب "دل دے دکھ ہزار" کے ساتھ سامنے آنے والی پہلی خاتون اور ان کے افسانوں کا مجموعہ خواتین میں اولیت کے اعزاز سے بہرہ مند ہے۔ ان کے موضوعات زندگی سے جڑے ہوئے اور ہندکو تہذیب، تمدن، رسم و رواج اور نفسیاتی درو بست کے نمائندہ ہیں۔

دوسری خاتون جنہوں نے اپنا مجموعہ پیش کیا قدسیہ قدسیہ ہیں اور مجموعے کا نام ''کنڈے کنڈے وادی'' ۔ ایک اور خاتون بھی افسانے کی دنیا میں موجود ہیں، مگر ان کی اب تک کتاب سامنے نہیں آئی۔ تاہم ان کا ایک خوبصورت افسانہ "دوریاں" اورنگ زیب غزنوی کے مرتب کردہ مجموعے ہندکو افسانے میں شامل ہے۔

بات کو سمیٹنے سے قبل ایک افسانہ نگار کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، جسے ہم ہندکو افسانے میں جدید عہد کے ارتقاء کا نام دے سکتے ہیں۔ آتش فہمید، جہانگیر تبسم، اسمعیل اعوان اور ان کے رفقا کے بعد جن لوگوں نے افسانے کو آگے بڑھایا اس میں یوسف عزیز زاہد، ناصر علی سید اور حسام حر کا نام قابل ذکر ہے۔ جب کہانی یہاں پہنچی تو ملک میں سیاسی، سماجی اور نفسیاتی تبدیلی رونما ہو چکی تھی۔ قدغنوں کا عہد آغاز پا گیا۔ بدلتے ہوئے ملکی حالات کے ساتھ اظہار کے معیارات بھی تبدیل ہو چکے تھے۔ اردو میں مزاحمتی کہانی علامتی چولا پہن چکی تھی۔ فکری سطح پر آنے والی تبدیلی فنی سطح پر محسوس ہونے لگی، چنانچہ بات کرنے کا ایک نیا ڈھنگ ایجاد ہوا۔

جو روایت کے تسلسل کے باوجود روایتی افسانے سے قدرے مختلف اور مشکل تھا۔ چنانچہ سرحد میں جن لوگوں نے اس تبدیلی کو محسوس کیا اور کہانی کو نئے حالات سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا ان میں یوسف عزیز زاہد، ناصر علی سید اور حسام حر کا نام بڑا اہم ہے۔ یوسف

Scanned by CamScanner

عزیز زاہد افسانہ لکھنے والوں کے اس قبیل سے ہے جنھوں نے افسانوں کو فنی اور موضوعی ہر دو اعتبار سے نئے ذائقوں سے ہم آمیز کیا۔ اردو میں لکھنے کے سبب اور اردو افسانے میں ہونے والی شکست و ریخت، انہدام و تعمیر و تشکیل کے تمام نشیب و فراز کو دیکھتا رہا تھا، چنانچہ ہندکو میں نئی کہانی لکھنے میں اسے اردو کے تجربے نے بڑی مدد دی۔ یہی کچھ صورت حال ناصر علی سید کے افسانے کی بھی ہے۔ اس نے جدید اردو افسانے کے ساتھ جدید ہندکو افسانے کی ساکھ قائم کرنے اور ہندکو افسانے کو زندگی سے ہم آمیز کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

جدید ترین کہانی کاروں میں خالد سہیل ملک تازہ ہوا کا ایک جھونکا ہے۔ اس کے مجموعے آپڑا وہڑا آپڑی کہانڑی نے جدید کہانی کے ایک نئے دور کو جنم دیا ہے۔ ناصر علی سید کا کہنا ہے کہ خالد سہیل نے مٹی میں گندھے ہوئے جو افسانے تحریر کیے ان کی زبان اور لہجے کا آہنگ بہت کم افسانہ نگاروں کو نصیب ہوا۔ اس نے افسانے کو ایک سنجیدہ سرگرمی سمجھ کر اسے پورا وقت دیا ہے۔ ناصر علی سید ٹھیک کہتے ہیں خالد سہیل کا افسانہ مکمل بھی ہے اور نیا بھی۔ اس کی زبان و بہان میں خالص ہندکو ہونے کے ساتھ ساتھ لہجہ اور ورتارہ اسی ریتل کا ہے، جہاں وہ زندگی کر رہا ہے۔ وہ حقیقت نگار ہے، اور حقیقت نگاری ایک مشکل فن ہے ذرا سی بے احتیاطی بڑی کہانی بننے سے روک دیتی ہے لیکن اس کا فن حقیقت کی برہنہ تصویروں کے باوجود کہیں مجروح نہیں ہوتا، دو آتشہ بن جاتا ہے۔ اسے افسانے کی جدید تکنیک، پیش کش، زبان و بیان پر مکمل گرفت حاصل ہے وہ صاحب اسلوب اور جدید نسل کا نمائیدہ افسانہ نگار ہے.....

اگرچہ فرداً فرداً لکھنے والوں کی ایک طویل فہرست بنائی جا سکتی ہے۔ مگر کسی ایک افسانے سے اس افسانہ نگار کا مطمع نظر یا Totality تلاش نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ ہندکو افسانے کے مجموعی جائزے میں صرف چند افسانوں کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں جو یقینی طور پر قاری کی توجہ کے حقدار ہیں۔ زکواۃ (انور خان) ڈبی ہوئی حویلی اور جیڑے سمجھن نہ جوش اشاریاں دا (جواد) مائے نی میں کنوں آکھاں اور پرفیوم (ظفر نوید

Scanned by CamScanner

جانی) ارماناں نی پنڈ اور چٹا ہنیرا (سید معصوم شاہ ثاقب) اپڑی اپڑی مجبوری (صبیح احمد) ذی القربیٰ (لیاقت حسین) سنگھیڑی دے تھلے (منور احمد) اور بجھدا ڈیوا (تنویر احمد) خاصے کی چیزیں ہیں..... انور خان کی کہانی زکواۃ اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کی افسانہ نگار نے زندہ موضوع کو جو معاشرے میں خیر و شر کی آویزش، حق تلفیوں اور ناانصافیوں کو جنم دیتے ہیں، اپنا موضوع بنایا ہے- اور اس خوبصورتی کے ساتھ جدید تکنیک میں کمپوز کیا ہے جس سے ایک طرف کہانی کی عظمت اور اس کے ساتھ ہی کہانی کار کی موضوع پر قدرت کا پتہ ملتا ہے،

ہندکو افسانے کا یہ مختصر جائزہ ہمیں اس نتیجے پر پہنچنے میں مدد دیتا ہے کہ ہندکو کہانی نے اپنا وہ مقام پالیا ہے جو اس کی دیگر ہم عصر زبانوں کو حاصل ہے..... ہندکو افسانہ نہ صرف زندگی کی ترجمانی کا بھرپور فریضہ ادا کر رہا ہے، بلکہ جہاں تک پہنچا ہے۔ وہ اس کا قابل فخر مقام بھی ہے۔

افسانے اور سفر کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ روز اول سے آج تک کسی نہ کسی صورت میں سفر افسانے کا ایک لازمی جز وچلا آتا ہے۔ اسی لیے جب سفر نے ایک الگ صنف کی صورت اختیار کی، تو قصہ گوئی کی روایت نے اسے نہ صرف سہارا دیا بلکہ اسے ایک سالم صنف کے طور پر تسلیم کرانے میں بھی کہانی کاری کی تربیت نے اس کی مدد کی۔ اگرچہ دیگر زبانوں میں سفر نامہ ایک مقبول صنف کے طور پر قبول کیا جا چکا ہے اور سینکڑوں سفرنامے شائع ہو کر داد پا چکے ہیں، مگر ہندکو زبان کا دامن بھی اس سے تہی نہیں۔

پہلا سفرنامہ سہیل انجم کا " گوتم دے دیس" ہے، جو تھائی لینڈ کے سفر کی زندہ داستان ہے۔ سہیل انجم ایک ٹیلنٹڈ نوجوان ہے، اس میں بے پناہ تخلیقی انرجی ہے مگر اس نے بہت کم لکھا ہے.....اس کے سفر نامے کے بارے میں ڈاکٹر رشید امجد کہتے ہیں:

> " گوتم دے دیس کو ہندکو میں اولیت کا درجہ تو حاصل ہوگا لیکن اپنے معیار اور فنی و فکری حیثیت سے بھی اسے ایک انفرادیت حاصل

Scanned by CamScanner

رہے گی۔"

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کہتے ہیں

"سہیل انجم کے سفرنامے کا اسلوب رواں دواں ہے۔ اس کی زبان نے متاثر کیا ہے۔"

ڈاکٹر اعجاز راہی نے فلیپ کے لئے لکھا کہ اس کتاب کے ساتھ ہی یہ سفر نامہ ایک مضبوط صنف کے طور پر ہندکو زبان و ادب کی فضیلت بڑھانے کا سبب بنے گا۔ اس سفرنامے میں ایک بالغ نظر ادیب، ایک شعور مند نقاد اور ایک عمیق نظر سیاح نظر آتا ہے۔ اس سفرنامے کے ساتھ ہی ہندکو سفرنامہ اپنے پورے قد کاٹھ کے ساتھ نظر آئے گا۔

دوسرا سفر نامہ جو ۱۹۰۷ء شائع ہوا شمالی علاقوں کی خوبیوں اور خوبصورتیوں کا احوال ہے۔ "راکا پوشی دی چھاں" ملک ارشد حسین کا لکھا ہوا یہ سفر نامہ ان کے قوت اظہار اور بیان کی قدرت کا بہترین نمونہ ہے جو ایک اچھے فکشن کے حوالے سے ہندکو کے لیے باعث توقیر ہے۔

تیسرا سفرنامہ ہندکو افسانے اور ادبیات کے محترم نام حیدر زمان حیدر کا "مبارک سفر حج" ہے۔ جو ان کی عقیدت اور محبت کا شہکار ہے۔ اس سفرنامے کے منظر نامے میں حیدر زمان کے فن افسانہ نگاری نے بڑی مدد کی ہے۔ بات کہنے کا سلیقہ اور احترام کی ارفعیت اس سفرنامے کا اہم پہلو ہے۔

ہندکو زبان کو یہ فضیلت بھی حاصل ہے کہ اس میں جدید اصناف کی موجودگی بھرپور ہے۔ خاکہ نگاری کے حوالے سے حسام حر کا "ہسدے وسدے لوک" خاصے کی چیز ہے۔ بڑے خوبصورت انداز میں شخصیتوں کو پیش کیا گیا۔ جہاں تک رائے کا تعلق ہے یہ خاکہ نگار کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے معروض کے بارے میں جو رائے چاہے دے، لیکن دل آزاری کی اجازت کسی طور نہیں ہوتی۔ اچھی خاصی خاکوں کی اس کتاب میں کہیں کہیں زبان اور بے مہابہ رائے کی آزادی نے اس کتاب کو ضعف پہنچایا ہے۔ تاہم ۲۵ خاکوں

Scanned by CamScanner

کے مجموعے کو ہندکو زبان میں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔

ہندکو کا پہلا ناول ''حق باہو'' ۱۹۹۶ء میں طبع ہوا، جو حسام حر کی تخلیق ہے، اور پشاور کی تہذیب کے ایک نہایت اہم موضوع پر لکھا گیا اور کمال فن اعجاز سے اس نے اس حساس موضوع کو سمیٹا ہے۔ یہ ہندکو کا پہلا ناول ہے

تراجم کی ذیل میں بھی ہندکو زبان پر ثروت ہو چکی ہے انگریزی سے شاعری کے منظوم تراجم میں ملک ارشد حسین اپنی تخلیقی قوت منوا چکے ہیں اب نوجوان لکھنے والے ہندکو افسانے میں دیگر زبانوں سے ترجمہ کر کے ہندکو زبان میں پر شکوہ روایت جنم دینے اور ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کرنے کی طرف توجہ کر رہے ہیں..... ان مجاہدین میں ممتاز نوجوان افسانہ نگار جواد کے دو تراجم خوب ہیں- گلزار کے دو افسانوں بملدار اور مائیکل انجلو کے نام سے جواد نے ہندکو میں ترجمہ کئے جبکہ نوجوان افسانہ نویس تنویر احمد نے ترکی کے چیتن التان کے افسانے کائنات دا راز اور ٹیگور کے مشہور افسانے کابلی والا کا ہندکو میں ترجمہ کیا ہے.....

ہندکو میں انشائیہ کی صنف بھی فروغ پا رہی ہے- خالد سہیل ملک ، محمد ضیاالدین اور لیاقت حسین کے انشائیے خاصے کی چیز ہیں.....

ہندکو زبان کو یہ تخصص حاصل ہے کہ اس میں تحقیق کا پہلو نمایاں ہے۔ شاعری کے بعد سب سے زیادہ تحقیق کی طرف توجہ دی گئی۔ زبان و ادب پر کام بھی زیادہ ہوا اور نثری کتابیں زیادہ تعداد بھی تحقیقی کتابوں کی تعداد بھی زیادہ ہے ۔ یہاں یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ تحقیقی کام زیادہ تر زبان کے حوالے سے ہوا اور ادبی دیگر اصناف پر قدرے کم۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ طبع شدہ ادب بہت دیر سے سامنے آیا اور زبان پر توجہ مبذول رہی تا کہ املا کا مسئلہ طے ہو سکے۔ اس حوالے سے دیکھیں تو ہندکو زبان کا سب سے پہلے تذکرہ سید فارغ بخاری کی شہرہ آفاق کتاب ادبیات سرحد میں ملتا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی اور اس میں ہندکو بولنے والی اقوام کی تاریخ کے ساتھ زبان کی تشکیل پر بھی

Scanned by CamScanner

بحث کی گئی ہے۔ اسی کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ ہندکو میں پہلا تنقیدی مضمون رضا ہمدانی نے ۱۹۵۳ء میں لکھا اور ماہنامہ پنج دریا کراچی میں طبع ہوا۔ یہ تحقیقی کتاب اصلا اردو میں لکھی گئی اور پشتو ادبیات سے متعلق تھی، اس لیے ہندکو کا ذکر زیادہ تفصیل سے نہیں آیا۔ مگر ۱۹۷۲ء میں سید فارغ بخاری نے ہندکو زبان و ادب پر ایک تفصیلی مضمون" تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند" کی چودھویں جلد کے(علاقائی ادب مغربی پاکستان جلد دوم) والے حصے میں شائع کیا۔ جس میں انھوں نے زبان کی پیدائش سے جدید عہد کے ادب تک صراحت کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ ۱۹۶۵ء میں فارغ بخاری نے ہندکو زبان کی تاریخ میں اہم مقام حاصل کیا اور ساتھ ہی اس کتاب "نویاں راواں" کا ایک مبسوط دیباچہ بھی تحریر کیا۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو کتابی شکل میں چھپے ہوئے ناموں کے ساتھ سب سے پہلے جن شعراء کا کلام سامنے آیا ان میں فارغ بخاری، رضا ہمدانی، مضمر تاتاری، خاطر غزنوی، جوہر میر، مختار علی نیر، تاج سعید، فہمید آتش، خادم ملک، اسماعیل اعوان، ناز درانی اور خالد خواجہ ہیں۔ اس مجموعے میں جدید عہد کے شعراء کی ۲۵ غزلیں اور ۴ گیت شامل ہیں۔

اسی سال تحقیق کی دوسری طبع کتاب مختار علی سید کی "ہندکو نثری کہانڑی" تھی، جس میں انھوں نے زبان کو سنوارنے کی طرف توجہ دی۔ املا کے مسائل طے کیے مختار علی نیر کی تحقیق و تنقید کی دیگر کتابوں میں ہندکو قواعد (۱۹۷۶ء)، متلاں (۱۹۷۴ء)، تاریخ زبان ہندکو (۱۹۷۷ء) تذکرہ قدیم شعراء ہندکو شائع ہوئیں۔ ان کی دو کتابیں جن کا تعلق ہندکو کی قدامت اور تاریخ سے ہے اردو میں بھی شائع ہو چکی ہیں، تاریخ زبان و ادب ہندکو اور عظیم گندھارا اور ہندکو ادب شامل ہیں۔

۲۰۰۳ء میں پروفیسر خاطر غزنوی نے "زبان اردو کا ماخذ ہندکو" اردو میں شائع کی۔ اس سے قبل انہوں نے مضامین میں تحقیقی رویوں کا اظہار کیا..... اسی ضمن میں ان کی کتاب ہندکو نامہ (۲۰۰۲ء) بھی خاصے کی چیز ہے.....

۱۹۷۸ء میں صابر حسین امداد کی کتاب "ہندکو رسم الخط ایک بحث" اور دوسری

Scanned by CamScanner

کتاب "ہندکو زبان ہور اس دا ماخذ" طبع ہوئیں۔

ش شوکت کی کتاب "ہندکو زبان دا تاریخی جائزہ" میں سامنے آئی۔

ڈاکٹر الٰہی بخش اختر اعوان نے پی ایچ ڈی کے لیے ہندکو کے بارے میں The Phonology of the Verbal Phrase in Hinko کے موضوع پر مقالہ تحریر کیا۔ اس کے علاوہ ان کے بے شمار مضامین ہندکو کے حوالے سے دیباچوں کی صورت میں موجود ہیں۔

ڈاکٹر الٰہی بخش اختر اعوان کی تازہ واردہ "ہندکو صوتیات" ایک اور معرکے کی تصنیف ہے ڈاکٹر صاحب نے ہمیشہ مشکل کام میں ہاتھ ڈالا ہے، صوتیات کا موضوع ہمیشہ سے سنجیدہ علماء کا کام رہا ہے اور ڈاکٹر اختر نے زبان کے اس مشکل موضوع یعنی علم لسانیات پر گراں قدر تصانیف تحریر کر کے ہندکو سے عشق کا ثبوت دیا وہیں - زیر نظر کتاب ہندکو صوتیات میں ڈاکٹر صاحب نے زبان کی ماہیت، تشکیل، فطری اور شعوری ماخذ، اصوات کا نظام، صوت اور صوتیے الغرض زبان کی ادائیگی سے لکھے جانے والے لفظ تک ایک فطری نظام کی نشاندہی کی ہے.....جو ان کی عمیق نگہی اور بصیرت افروز تحقیق کا نتیجہ ہے.....

سلطان سکون نے ۲۰۰۲ء میں ۲۵۸ صفحات پر مشتمل "ہندکو اردو لغت" مرتب کی۔ جو یقیناً ہندکو تحقیق میں ایک اہم قدم ہے ..... اگرچہ یہ ہزاری لہجے کی نمائندہ ہے تاہم ہندکو زبان کے لیے نیک فال ہے.....اسی ضمن میں ان کی کتاب بجھ میری بجھارت بھی اہم تصنیف ہے۔

قائد اعظم یونیورسٹی کے شعبہ پاکستان سٹڈی نے بھی ہندکو پر کام کیا اور اورنگ زیب غزنوی کی مرتب کردہ کتاب "ہندکو افسانے" میں محمد امجد امین نے افسانے کے حوالے سے ایک نہایت مربوط و منضبط مضمون لکھا۔ جو ہندکو کے حوالے سے افسانے پر پہلا خوبصورت مضمون ہے.....

مجاہد اکبر نے ۱۹۹۴ء میں ہندکو قاعدہ تحریر کیا۔ اورنگ زیب غزنوی نے سیرت

Scanned by CamScanner

نبی پر ایک خوبصورت کتاب تحریر کی۔ حسام حر کی کتاب "حدیثاں پاک رسول دیاں" ہندکو ترجمے کے ساتھ پیش کی۔ حیدر زمان حیدر "ہندکو چار بیتے کے رنگو رنگ ندارے" اور کئی دیگر ہندکو ادیبوں نے تحقیق و تنقید کی مشقت اٹھائی۔ اب تنقید ہندکو رسائل اور جرائد میں کثرت سے ملتی ہے اور ادب کے تمام رنگ اس میں سمو چکے ہیں- موسیقی، مصوری،، سنگ تراشی، شخصی اور سیاسی مضامین، انٹرویوز، رپورتاژ، مشاعروں کی روداد یں اور کتابوں پر تبصرے بڑی تعداد میں مل جاتے ہیں......

انسان کی مابعدالطبیعاتی زندگی کا تھیٹر کے ساتھ گہرا تعلق رہا ہے-دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے قدیم انسان نے submition کے جو بہترین طریقے اختیار کئے ان میں تھیٹر سب سے زیادہ موثر اور مقبول رہا ہے-مغرب کے اہل دانش کا خیال ہے کے تھیٹر مذہب کے سائے میں پروان چڑھا مگر نائجیریا کے یکتائے روزگار ڈراما نقاد اووہ مویبلا کا کہنا ہے کہ تھیٹر تو عوامی تہواروں کا جزو لاینفک ہے یہی اس کی جنم بھومی ہے اور جب تک اسے چار دیواری میں مقید نہیں کیا گیا اس وقت تک یہیں پرورش پاتا رہا ہے-اصلاً یہ عوامی جذبات کے اظہار کا ایک مضبوط ذریعہ بھی اور عوامی میلوں ٹھیلوں کا ایک خوبصورت رنگ بھی - دیوتاؤں کی خوشنودی کے لئے انسان نے اسے بہت دیر سے اپنایا- دیوتا تو انسانی شعور کی پیداوار ہیں اور خوابیدگی کے ادوار میں بھی انسان جذبوں اور جذبات کا اسیر تھا- چونکہ یہ اظہار کا ایک طاقتور ذریعہ ہے چنانچہ دیوتائی عہد میں اسے مذہب کے اکابرین اپنا لیا- انسانی ارتقا کے ساتھ ساتھ یہ بھی ارتقا پذیر رہا- ڈرامے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ دیگر اصناف کی طرح انفرادی شے نہیں بلکہ اجتماعی صنف ادب ہے اسی لئے اسے ہمیشہ فضیلت حاصل رہی-اگرچہ ڈرامے کی تاریخ قدیم ہے لیکن برصغیر میں اس کے آثار ۵۰۰ ق م میں بھی مل جاتے ہیں- اگرچہ ۱۸۵۲ء میں امانت اندرسبھا تحریر ہوئی مگر تھیٹر کے حوالے سے اصل شہرت ڈاکٹر بھاؤ داجی لاڈ کے ڈرامے گوپی چند اور جلندھر کو نصیب ہوئی-

Scanned by CamScanner

سرحد میں تھیٹر کی روایت قدیمی اور اردو سے وابستہ ہے۔لیکن ہندکو میں اس نے آنے میں دیر لگا دی۔تاہم پشتو میں اس نے پہلے روپ لیا اور اپنے ابتدائی ادوار سے نکل کر اسے پشتو ادبیات نہایت ہی اہم نام میل گئے جن میں امیر حمزہ شنواری اور سمندر خان سمندر جیسے نابغہ روزگار شامل ہیں۔ اگرچہ برصغیر فلم و تھیٹر کے بعض بڑے نام ہندکو کے مرکزی شہر پشاور سے تعلق رکھتے تھے مگر ان کو بمبئی کی چکا چوند نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ تاہم ۱۹۵۰ء کے بعد ہندکو میں لکھا جانے والا پہلا ڈراما مختار علی نیر کا خیر و فضل تھا اور ریڈیو سٹیشن کے قیام کے بعد ہندکو کو بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے کے مواقع ملے یہاں بھی زیادہ تر ڈرامے مختار علی نیر کی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں ہندکو پروگرام کا آغاز مشاعرے سے ہوا پھر مختلف نوعیت کے پروگراموں کے ذریعے ہندکو فیچر، ڈراما، ٹاک، شاعری، افسانہ، دینیات اور دیگر متنوع اصناف ادب عوامی زندگی کا حصہ بننے لگا۔ یہیں ہندکو ڈرامے کو ریڈیو سے پیش کرنے کا چلن ہوا۔ ان لکھنے والوں میں جوہر میر، سید مظہر گیلانی، مسعود انور شفقی، رضا ہمدانی، احسان طالب، فارغ بخاری اور کئی دیگر نامور ادیب آگے بڑھے۔ ریڈیو کے بعد ٹیلی ویژن کے آنے سے ٹیلی ڈرامے کو تقویت ملی۔ ٹیلیوژن کا آغاز ۱۹۷۴ء میں ہوا اور اس کے قیام کے کچھ ہی دنوں کے بعد سب سے پہلا ڈراما ''لاڈلے'' تھا جسے مختار علی نیر نے تحریر اور اسے عتیق احمد صدیقی نے پیش کیا۔ اس کے بعد ہندکو کا پہلا طویل دورانیے کی اقساط وار سیریل ''تتیاں چھاواں'' لکھ کر ہندکو کی کم مائیگی کے اس احساس کو مٹا دیا کہ ہندکو میں طویل مضامین لکھنے کی گنجائش نہیں۔ اس کے بعد نئے نئے ادیب شامل ہوتے اور ہندکو کی زلفیں سنوارتے رہے۔ مختار علی نیر نے کئی پروگرام لکھے ان میں سے بعض قومی سطح پر سراہے گئے۔قومی ایواڈ بھی ملے ان میں دیکھدا جاندا رہ اور ہندکو ثقافت پر ہفتہ وار پروگرام خصوصیت کے حامل ہیں۔بعد ازاں ڈراما لکھنے والوں میں نئے نام شامل ہوتے رہے ان میں تاج سعید، فقیر حسین ساحر، مشتاق شباب، نذیر بھٹی، یونس قیاسی، ناصر علی سید، ڈاکٹر اشرف عدیل اور ڈاکٹر اعجاز راہی شامل ہیں۔ موخرالذکر دونوں کی ہندکو ڈرامے میں انٹری

Scanned by CamScanner

سیریل کے ساتھ ہوئی - ناصر علی سید نے کئی سولو اور سیریل لکھے اور ان کے سیریل زندگی کو بے شمار داد ملی چنانچہ ڈرامے کی پہلی کتاب زندگی کے نام سے پیش کر کے اولیت کا اعزاز بھی پایا- ہندکو ڈراموں کو پیش کرنے والوں میں عتیق احمد صدیقی ، فرخ سیر ، توفیق حسین شاہ ، ، نسیم جان ، طارق سعید اور کئی دیگر شامل تھے- بات کو سمیٹتے ہوئے میں دو کتابوں کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں- زبان و ادب کے ساتھ اہل زبان ، رسم ورواج اور ثقافت کے دیگر عناصر کا ذکر نہ ہو تو زبان کے بنیادی نفسیاتی علائق سے آگاہی مکمل نہیں ہوتی - اگرچہ پشاور کی تہذیب وتمدن کے حوالے سے کئی کتابیں طبع ہو چکی ہیں مگر ڈاکٹر امجد حسین کی تصانیف ''یک شہر آرزو'' اور'' عالم میں انتخاب پشاور'' اچھوتے انداز میں اس خطے کی نہ صرف تاریخ بلکہ ثقافت کی متنوع جہات بھی کھلتی چلی جاتی ہے - ہندکو رہتل ، رسم و رواج ، لباس اور نفسیاتی دروبست سب کچھ اس میں موجود ہے- زبان و ادب کے حوالے جا بجا درج ہیں جس سے ایک غیر مربوط تاریخ ادب مرتب ہوتی محسوس ہوتی ہے- ڈاکٹر امجد نے ہندکو تہذیب کے حوالے سے ایک جداگانہ اسلوب کا آغاز کیا ہے-

ہندکو ادبیات کا یہ مطالعہ اگرچہ میرے کم وسائل کے سبب ہندکو کے ساتھ پورا انصاف نہیں کر سکا ، اس کا مجھے احساس ہے مگر موجودہ وسائل کے دائرے میں کئی نئے گوشے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں یقیناً کامیاب بھی رہا ہوں اور خاص طور پر نوجوان نسل سے توقع ہے کہ وہ اس کام کو آگے بڑھائے گی کہ زبانوں کی تلاش کا عمل کہیں نہیں رکتا اور خوب سے خوب کی تلاش ہمیشہ جاری رہتی ہے......

(یہ مقالہ اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کی پاکستانی زبانوں کی ورکشاپ کے لئے لکھا گیا)

•••○•○•••

Scanned by CamScanner